© rasailojaraid.com

پاکستانی معاشرے میں دینی مدارس کا کردار

ڈاکٹر خالد علوی☆

دینی مدارس کے خلاف منظّم مہم میں قدرے توقف آیا ہے لیکن پاکستان کے انگریزی پریس میں اب بھی انہیں ہدفِ تنقید بنایا جارہا ہے۔ یہ مہم اتنے زوردار انداز میں چلائی گئی اور ملکی بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں وہی بات اتنے متنوع انداز سے دہرائی گئی کہ عام قاری یہ باور کرنے لگا کہ دینی مدارس تخریب کاری کے اڈے اور ترقی دشمنی کے مراکز ہیں۔ اس منظّم اور جارحانہ پروپیگنڈے کا نہ صرف مناسب دفاع ہی نہیں ہو البتہ غیر جانبدانہ تجزیہ بھی نہیں ہو سکا۔ خوف وہراس کے اس ماحول میں کوئی شخص کچھ کہنے اور لکھنے کی سکت نہیں پارہا تھا۔ دینی مدارس کے خلاف اس یک طرفہ جارحیت کا تجزیہ بے حد ضروری ہے کیونکہ اس کے ذریعے اعتدال و توازن کی راہ حاصل کی جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل سطور اسی نقطۂ نظر سے لکھی جارہی ہیں۔

دینی مدارس کی مخالفت کا پسِ منظر

دینی مدارس کے خلاف پاکستان کے بااختیار طبقات ہمیشہ سخت رویہ رکھتے رہے ہیں۔ نام نہاد روشن خیال، مغربی نظام تعلیم کے فارغ التحصیل، مشنری اداروں کے تعلیم یافتہ اور براہ راست یورپ و امریکہ کی یونیورسٹیوں کے پڑھے لکھے لوگ دینی مدارس کو پسماندہ طبقات کی بیکار مصروفیت کا ذریعہ کہتے تھے۔ دینی مدارس کا نصاب، اساتذہ و طلبہ کے رجحانات اور دینی طبقہ کے اثرات کو کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ یہ لوگ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے کوئی مسئلہ نہ تھے۔ سول سروس، آرمی، عدلیہ اور دیگر اعلیٰ و

☆ ڈائریکٹر جنرل، دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی یونیورسٹی، اسلام آباد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ادنی ملازمتیں صرف جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے تھیں۔ ملک کے وسائل پر پچھلے پچاس برسوں میں انہی لوگوں کا قبضہ ہے۔ تمام مراعات صرف مغربی نظام کے تعلیم یافتہ طبقہ کو حاصل تھیں۔ دینی مدارس کو زکوٰۃ و صدقات کا کچھ حصہ ملتا۔ محدود تعداد کی مذہبی قیادت کو چھوڑ کر عام دینی تعلیم یافتہ غربت اور پست معیار زندگی پر قانع رہتا۔ ان پر زندگی کی تمام راہیں مسدود تھیں۔ مسجد کی امامت اور مدرسہ کی معلّمی کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔ تعلیمی درسگاہیں، صحافت، عدلیہ سول سروس اور عسکری اداروں کے دروازے بند ہی رہے۔ مغربی معاشرت، مغربی ادب انگریزی زبان اور دین بیزاری کا ایک کلچر تھا جو پچھلے پچاس برس سے پاکستان پر مسلط ہے۔ یہ طبقات غالب قوت کی حیثیت سے اتنے مستحکم تھے کہ انہوں نے دینی مدارس اور اس کے تعلیم یافتہ لوگوں کو حقارت سے نظر انداز کیا۔ انہیں دینی اداروں کے خلاف نفرت تو تھی لیکن ان سے کوئی خطرہ نہ تھا کیونکہ وہ اپنے آپ کو مستحکم سمجھتے تھے۔ اقتدار و اختیار کے منابع پر ان کا قبضہ تھا لہٰذا ملک کے اندر تمام پالیسیاں انہی کے ذریعہ بنتیں اور انہی کے توسط سے نافذ ہوتیں۔ اگر کبھی کوئی عوامی رد عمل ہوا بھی تو انہیں کوئی فرق نہ پڑا کیونکہ آنے والا بھی اسی کلب کا ممبر تھا جس کا جانے والا تھا۔

مراعات یافتہ طبقہ کی سیاسی و معاشی قوت کے علاوہ جس چیز نے دینی مدارس سے متعلق لوگوں کو بے اثر بنا رکھا تھا وہ ان کی اپنی کمزوری بھی تھی۔ ان کی اپروچ محدود تھی، نصاب تعلیم عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نہ تھا، وہ اس میں کسی تبدیلی کے لئے تیار نہ تھے اور سب سے بڑھ کر ان کی سوچ محدود فرقہ وارانہ مسائل تک محدود تھی۔ وہ قیل و قال کی دنیا سے نکلنے کو تیار تھے اور معاشرے کی تغیر پذیری کے ادراک سے بے نیاز تھے۔ ان کے ہاں سب سے بڑا کمال اختلافی مسائل کا شعور، اس کے دلائل کا ادراک اور فریق مخالف کی تحقیر و تکفیر پر قادرانہ اظہار تھا۔ یہ اتنا پرکشش ماحول اور دلچسپ مشغلہ تھا کہ انہوں نے کبھی بھی جدید تعلیم یافتہ سیکولر اور دین بیزار طبقات کے اثر و رسوخ اور طاقت کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔ کبھی کبھی اپنی بے بسی کے ادراک پر تقدیر اور زمانہ کی شکایت کر کے خاموش ہو جاتے اور معمول کے مشاغل میں مصروف ہو جاتے۔ اہل خیر کے صدقات و خیرات ان کے معمولی معیار زندگی کو قائم رکھتے اور یوں وہ کسی بڑی کوٹھی، کار یا تعیشات دنیا کا تصور بھی نہ کرتے کہ حاسدانہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جذبات کی وجہ سے مراعات یافتہ طبقات کے خلاف صف آراء ہوتے۔

ان کی محدود مذہبی سوچ نے انہیں اسلام کے حرکی تصور سے بھی محروم رکھا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اسلام کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اجتہادی پہلوؤں پر جو تحریکی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی تھی اسے بھی یہ حضرات جذب نہ کر سکے۔ بلکہ سیکولر حلقوں نے اسلامی تحریک کو حقیقی خطرہ سمجھ کر جب اس کے خلاف محاذ آرائی کی تو دینی حلقوں کو تحریک کے خلاف استعمال کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سیکولر حلقوں کی اس شاطرانہ چال کو نہ سمجھنے کی وجہ بھی محدود مذہبی سوچ تھی۔ تصور کی اس محدودیت نے اسلامی تحریک کے ہمہ گیر اور فعال پروگرام کی مخالفت پر انہیں آمادہ کیا جس تحریک کا انہیں ہراول دستہ ہونا چاہیے تھا وہ اسی تحریک کے لئے سد راہ بن گئے۔ جمود، تعطل، انفعالیت اور محدودیت وہ عناصر ہیں جو دینی مدارس کے ماحول کا خمیر بن گئے۔ ایسے لگتا کہ اپنے ماحول میں متحجر ہو گئے ہیں گردوپیش کے تغیرات، زمانے کے احوال، معیشت کے اثرات اور تاریخ کے جبر نے ان کے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ ان کی مثال تاریخ کے بچھڑے ہوئے قافلے کی ہے جسے اپنی منزل کا پتہ نہیں۔ بقول شاعر

یاران تیز گام نے منزل کو جالیا
اور ہم محو نالہ ہائے جرس کارواں رہے

یہ لوگ اپنے مدارس کی چار دیواری، اپنی پرانی کتابوں کے اوراق میں اور اپنی مسجدوں کے احاطوں میں گم تھے۔ پسماندہ، نظرانداز کئے ہوئے، معاشرے کی ہماہمی سے بے نیاز اپنے حال میں مست اور تاریخ کے گم شدہ اوراق کی طرح مدفون تھے کہ یکایک ایک جھٹکے نے انہیں جگا دیا۔ یہ جاگ اٹھے گویا اصحاب کہف اپنی نیند سے بیدار ہوئے۔ یہ جھٹکا افغانستان پر سوویت یونین کا حملہ تھا۔ اس حملے نے ملت افغانیہ کو ہی محکوم نہیں کرنا تھا پاکستان اور عالم اسلام کے دل شرق اوسط پر تسلط حاصل کرنا تھا۔ سوشلزم ایک کفر تھا جس کا مقابلہ صرف جذبہ جہاد اسلامی سے کیا جا سکتا تھا۔ جہاد ایک متروک حقیقت تھا جسے از سر نو زندہ کیا گیا اور اسے زندہ کرنے میں مغربی ممالک بالخصوص امریکہ کی حوصلہ افزائی نے اہم کردار ادا کیا۔ جہاد افغانستان نے مسلم امت کو نہ صرف نیا تشخص دیا بلکہ ایک انوکھا اعتماد عطا کیا۔ اس صورت حال سے زیادہ فائدہ دیندار طبقہ کو ہوا۔ بائیں بازو کے دانشور تو اس کی کامیابی کی آرزو میں جی رہے تھے جبکہ دائیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بازو کے سیکولر حضرات اپنی امیدیں امریکہ سے وابستہ کیے ہوئے تھے۔ دونوں طبقات اسلامی تشخص سے خائف تھے۔ روس افغانستان سے نکل گیا۔ امریکہ کی مہربانی اور جونیجو حکومت کی دانشمندی سے افغانستان کا مسئلہ نتیجہ خیز حل کے بغیر زندہ رہا۔ مختلف افغان گروپوں کی باہمی کشمکش نے اس مسئلے کو اور الجھایا۔ یہی وہ مرحلہ تھا کہ ایک نیا گروہ منظر عام پر آیا۔ طالبان کے نام سے مصروف عمل یہ گروہ بالآخر افغانستان کے بڑے حصے پر قابض ہو گیا۔ دینی مدارس کے فارغ شدہ اور زیر تعلیم افغان طلبہ اور اساتذہ سے تشکیل پانے والا گروہ اپنے اسلامی تشخص کے اظہار پر مصر رہا۔ وسط ایشیا کی جیوپولیٹیکل اہمیت کے پیش نظر افغانستان کی بد نظمی خصوصی اہمیت اختیار کر گئی اور طالبان آہستہ آہستہ انتہا پسندی اور دہشت گردی کی تصویر بنا دیئے گئے۔ جہاد افغانستان نے مسلمانوں کو جو شعور دیا اس سے اپنے مسائل، اپنی ضروریات اور اپنی چھپی قوتوں کا احساس ہوا۔ اتحاد امت کے جذبے بیدار ہوئے اور بین الاقوامی منصوبہ بندیوں سے زیادہ واقفیت ہوئی۔ اس لیے یہ ضروری ہوا کہ اسلامی تشخص کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ آغاز بین الاقوامی ذرائع ابلاغ سے ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے مقامی ذرائع ابلاغ وہی زبان بولنے لگے۔ اب مجاہدین کو دہشت گرد، اسلامی تشخص کے شعور کو بنیاد پرستی، انتہاپسندی، قدامت پسندی اور تہذیب دشمنی کا نام دیا جانے لگا۔ اس سلسلے میں دائیں بازو کے امریکہ نواز اور بائیں بازو کے دین بیزار متحدہ محاذ کا حصہ ہیں۔ طالبان کے حوالے سے دینی مدارس توجہ کا مرکز بنے اگر پچھلے کچھ عرصہ کا پاکستان کا انگریزی پریس دیکھا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جب طالبان، دینی مدارس اور انتہاپسندی کے بارے میں مواد موجود نہیں ہوتا۔ اسامہ بن لادن کی شخصیت نے اس رویہ کو نیا رخ اور نئی قوت عطا کی ہے۔ پاکستان میں شیعہ وسنی فسادات بھی دینی مدارس کے خلاف نفرتیں پیدا کرنے کا ذریعہ بنے۔ شیعہ انتہاپسندی، ایرانی مداخلت اور مقامی جاگیردارانہ مفادات کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے یک طرفہ طور پر دینی مدارس کو نشانہ بنایا گیا۔ دینی مدارس کی معصومیت کی بات نہیں اور نہ ان کا دفاع مطلوب ہے بلکہ غیر جانبدارانہ تجزیہ ہے تاکہ ان کی مثبت اور منفی کردار کو سمجھا جاسکے۔ پاکستان کے شیعہ دانشوروں نے بائیں بازوں کے نظریات کی تبلیغ اور انحرافی طرز عمل میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ پریس اور الیکٹرانک میڈیا میں خصوصی نفوذ کے باعث وہ رائے عامہ پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ شیعہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے سیاسی تاثیر کے باعث ہمیشہ سیکولر اور مذہب بیزار پالیسیوں کی حمایت کی ہے۔ جب دینی مدارس کے خلاف مہم چلی تو فرقہ وارانہ نظریات اور سیکولر رجحانات کے مغرب نواز حلقے متحد ہو کر اس بے بس مخلوق پر ٹوٹ پڑے۔

دینی مدارس کا ارتقاء

مخالفت کے پس منظر کو سمجھنے کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دینی مدارس کی حیثیت کیا ہے ؟ یہ کیسے وجود میں آئے اور کیسے زندہ رہے ؟ مدرسہ جس کے معنی پڑھنے کی جگہ ہے مسلمانوں کی علمی روایت کا نشان ہے۔ اسلام سے پہلے علم صرف مخصوص مذہبی اور سیاسی طبقے تک محدود تھا۔ یہ انقلاب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیدا کیا کہ علم کو عام آدمی تک پہنچایا بلکہ حصول علم کو ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیا۔ صاحبان اقتدار اور مذہبی گروہوں کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا کہ علم کو محدود لوگوں کی دسترس میں رکھو تاکہ عوام تابع فرمان رہیں۔ حضور اکرمؐ نے تعلیم کو عام کرنے کی اسلامی پالیسی مرتب کی جس پر آنے والی مسلمان نسلوں نے عمل کیا۔ مسجد نے تعلیم کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ وقت گذرنے کے ساتھ مستقل تعلیمی ادارے وجود میں آئے۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مطابق پہلا مدرسہ مصر کے فاطمی حکمران الحاکم نے ۳۹۵ھ میں قائم کیا جسے وہ دارالحکمۃ کہتا تھا۔ مصر کی مشہور اسلامی یونیورسٹی الازھر بھی فاطمی دور کی یادگار ہے۔ فاطمی چونکہ شیعہ تھے اس لئے ان کے زیر انتظام علاقوں میں دارالعلم کے نام سے ادارے قائم ہوئے جبکہ سنیوں کے ہاں مدرسہ کے ادارے نے فروغ پایا۔ سلجوقیوں نے ۴۴۷ھ میں بغداد پر کنٹرول حاصل کیا تو ان کے زیر انتظام علاقہ میں مدارس کا سلسلہ مستحکم ہوا۔ اسلامی دنیا میں مدارس کی توسیع و ترقی میں الپ ارسلان اور ملک شاہ کے وزیر اور اپنے وقت کے عظیم دانشور نظام الملک کو بڑا دخل ہے۔ نظام الملک کی پیروی میں نور الدین زنگی نے دمشق میں اور اس کے نواح میں مدارس کا سلسلہ شروع کیا۔ نظام الملک نے بغداد اور نیشاپور میں شاندار مدارس قائم کئے جن میں امام غزالیؒ اور ان کے استاد امام الحرمین جیسے اساتذہ پڑھاتے رہے۔ ایوبی خاندان کے تحت مصر میں مدارس کا سلسلہ شروع ہوا اور پورے مصر میں مدارس کا جال بچھ گیا۔ پوری اسلامی دنیا مدارس سے مستفید ہوتی رہی اسلامی تہذیب کے غلبہ کے دوران یہ مدارس مسلمانوں کی دینی اور دنیوی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے تعلیم مہیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے تھے۔ ان میں قرآن و حدیث کے علاوہ دیگر علوم و فنون بھی پڑھائے جاتے تھے۔ ابن سینا، الخوارزمی، البیرونی اور دیگر مسلمان سائنسدان انہی مدارس کے پروردہ تھے۔ بخارا اور نیشاپور سے لیکر بغداد اور دمشق تک اور مصر سے لیکر مغربی افریقہ اور اندلس تک یہ مدارس علم و حکمت کے موتی بکھیر رہے تھے۔

برصغیر میں اسلام وسطی ایشیا کے راستے داخل ہوا لہٰذا یہاں کے تعلیمی نظام میں فقہ حنفی کو خصوصی حیثیت حاصل تھی۔ مسلمان سلاطین کے عہد میں مسلمانوں کی تعلیم کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت پر مفصل کتاب لکھی ہے۔ تفصیل کے خواہشمند اسے دیکھ سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے سیاسی غلبے کے تحت تعلیم و تربیت کا نظام جاری تھا اور انہیں ملازمتوں اور کاروبار کے لئے کسی غیر صحت مند اور متعصبانہ مقابلے کا سامنا نہیں تھا۔ یہ درست ہے کہ بحیثیت مجموعی زوال پذیر سیاسی نظام کی وجہ سے نصاب تعلیم اور طریق تعلیم میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ عالمی سطح پر پیدا ہونے والی تبدیلیوں سے بے خبری کے باعث مسلمان قیادت نظام تعلیم میں کوئی بڑی تبدیلی نہ پیدا کر سکی۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو اس وقت جھٹکا لگا جب اقتدار ان سے چھین لیا گیا اور انگریز اپنی عسکری تنظیم اور بہتر اسلحہ کے زور پر ہندوستان پر قابض ہو گئے فارسی اور اردو مسلمانوں کی سرکاری اور ثقافتی زبانیں تھیں۔ مدارس اور اوقاف ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا محور تھے۔ مسلمان ثقافتی طور پر آراستہ و شائستہ لوگ تھے اور معاشرتی اعتبار سے اول درجہ کے شہری تھے۔ گو اقتدار ان سے چھین گیا تھا لیکن اس کی خوبی ان میں باقی تھی۔

انگریزوں نے اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے اپنا نظام تعلیم رائج کیا انگریزی زبان کی حیثیت مرکزی قرار دی۔ نظام سلطنت میں ملازمتوں کے دروازے صرف ان پر کھلے جو اس نظام تعلیم کے پروردہ تھے۔ ہندوؤں نے انگریزوں کو نجات دہندہ سمجھا اور انگریزی نظام تعلیم سے استفادے میں پہل کی بلکہ انگریزی راج کے مرکزی دفاتر کلکتہ میں بنگالی ہندو بابوؤں کی حیثیت مشینری کے کلیدی کل پرزوں کی تھی۔ مسلمان جو انگریزی غضب کا شکار تھے آہستہ آہستہ انگریزی نظام تعلیم کی طرف آئے۔ انگریزوں نے دانستہ طور پر مسلمانوں کے نظام تعلیم کو تباہ کیا۔ ان کے اوقاف ضبط کئے مساجد کی کفالت ختم ہوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عربی، فارسی اور اردو کی اعلیٰ حیثیت ختم کی۔ اردو کو ختم کرنے کے لئے ہندی ایجاد کی اور ہندوؤں کو فارسی رسم الخط کے خلاف مخاصمت پر آمادہ کیا اور سیاسی طور پر ان کی سرپرستی کی۔ یہ تھے وہ حالات جن میں دینی مدارس قائم کرنے کی نئی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کے پیچھے مسلمانوں کے دینی علوم کا تحفظ اور ان کے اسلامی تشخص کی حفاظت تھی۔ ان مدارس کا کام دینی مدرس، آئمہ مساجد، خطباء اور مسلم اطبا پیدا کرنا تھا۔ لکھنو، دہلی، بدایوں، بریلی، سہارنپور، دیوبند، رامپور، لاہور، سیالکوٹ اور دیگر علاقوں میں قائم مدارس نے ملا نظام الدین کا مرتب کردہ نصاب اختیار کیا جس میں عربی زبان و ادب اور تفسیر و حدیث کے علاوہ فقہ، اصول فقہ، منطق، فلسفہ حساب اور طب شامل تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے بانیوں نے ۱۸٦۷ء میں جن مقاصد کے تحت اسے قائم کیا تھا ان میں آزادی ضمیر اور اعلائے کلمۃ الحق کے علاوہ مندرجہ ذیل شامل تھے۔

۱۔ مسلمانوں کو ایک تنظیم میں پرونے کی جدوجہد۔

۲۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے مسلک کی حفاظت و اشاعت۔

۳۔ مسلم معاشرے سے خود غرقی و استبداد کا خاتمہ۔

۴۔ علوم دینی کا احیاء۔

۵۔ علوم عقلیہ کی صحیح تربیت۔

٦۔ دین میں مہارت کے ساتھ دنیاوی علوم کے تقاضے پورے کرنا۔

بانی دارالعلوم مولانا نانوتویؒ نے ایک موقعہ پر کہا تھا کہ

فی زمانہ کفار کا غلبہ ہے وقت نہیں ہے کہ مسلمانوں میں تفریق کو ہوا دی جائے جس سے ان کا کلمہ متفرق ہو کر مزید ضعف پیدا ہو۔ بلکہ توڑنے کی بجائے جوڑنے کی فکر کی جائے۔ لیکن جلد ہی یہ روح کمزور ہونے لگی۔ اس کا سبب تو انگریزوں کا دباؤ تھا جنگ آزادی میں جن علماء نے حصہ لیا تھا ان کے شاگردوں کے بارے میں انگریز کا رویہ غیر مصالحانہ تھا۔ ان کے خلاف جو تدبیر بھی مناسب تھی اسے اختیار کرنا ضروری سمجھتا تھا اس کے علاوہ بعض علماء نے بعض عبارات کی تعبیر کے اختلاف پر علماء دیوبند کے خلاف مہم چلائی جو برصغیر کے دینی ادب کی بد صورت نمائندگی ہے۔ دیوبند، بریلی اور مراد آباد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بدایوں اور فرنگی محل کے اختلافی بیانات کی صدائے بازگشت اب بھی سنی جا سکتی ہے۔ انہی اختلافات کی بنیاد پر مدارس کے قیام کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو پورے برصغیر پاک و ہند میں پھیل گیا۔ اسی دوران مسلمانوں نے انگریزی نظام سے استفادے کا سلسلہ شروع کیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی، اسلامیہ کالج لاہور، اسلامیہ کالج پشاور کے علاوہ ہائی سکولوں کا ایک سلسلہ منظم کیا جسے اسلامی انجمنیں چلاتی تھیں تاکہ مسلمان جدید تعلیم میں پیچھے نہ رہیں۔ ان اداروں نے مسلمانوں کو نئے نظام میں ملازمتیں دلانے کی راہ ہموار کی لیکن اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ دینی ادارے عملی دنیا سے دور ہوتے گئے اور ان میں تنہائی پسندی اور مذہبی جمود بڑھا مسلم معاشرے میں ایک تضاد پیدا ہوا۔ ایک طرف جدید تعلیم یافتہ جو دین سے ناواقف ہی نہیں بعض اوقات بیزار بھی ہوا اور دوسری طرف دینی مدارس کا فارغ التحصیل جو مسجد اور دینی مدرسے تک محدود ہو گیا اور جدید تعلیم کے بارے میں شکوک میں مبتلا ہو گیا۔ اس دوئی کا نقصان مسلمانوں کو ہوا کہ مسلمانوں کو انگریز ہندو گٹھ جوڑ کے مقابلے میں جس اتحاد و یکجہتی کی ضرورت تھی وہ مجروح ہو رہی تھی۔

برصغیر پاک و ہند کی آزادی میں مسلمانوں کی حیثیت ہر اول دستہ کی تھی اور قیادت علماء کے ہاتھ میں تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کا قائدانہ کردار کم ہوتا گیا اور اب جدید تعلیم یافتہ طبقہ آگے بڑھا اور عملاً قیادت پر قابض ہو گیا۔ جمعیت علماء ہند اور مجلس احرار کے علماء انگریز دشمنی میں اتنے آگے چلے گئے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کا کما حقہ ادراک نہ کر سکے۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ کانگرس کے جدید تعلیم یافتہ ہندو قیادت سے تو علماء ڈائیلاگ کر سکتے تھے لیکن مسلم لیگ کی جدید تعلیم یافتہ قیادت کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا تھے اس کے رویے نے تحریک پاکستان کے دنوں میں علماء کے ایک گروہ کو عملی سیاست سے اور دور کر دیا۔ قیام پاکستان میں قائدانہ کردار ایک جدید تعلیم یافتہ بیرسٹر قائداعظم محمد علی جناحؒ کا تھا جو ایک مبرہن حقیقت ہے۔

پاکستان میں دینی مدارس کی تاثیر

قیام پاکستان کے بعد ریاست کے معاملات پر عملاً جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا قبضہ تھا کیونکہ جدید ریاست کا ماڈل برطانوی طرز پر مبنی تھا اور اس کو وہی لوگ چلا سکتے تھے جو اس نظام کے مطابق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تربیت یافتہ تھے دینی مدارس اور اس کے فارغ التحصیل علماء اس نظام میں کسی طرح کھپ نہیں سکتے تھے اس لئے دینی مدارس نے دینی علوم کی تدریس اور اخلاقی و روحانی قدروں کی ترویج کے لئے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ قیام پاکستان کے بعد نئے مدارس قائم ہوئے۔ لاہور، کراچی، پشاور اور راولپنڈی کے علاوہ ملک کے طول و عرض میں مدارس کا ایک جال بچھ گیا۔ ۱۹۴۸ء سے لیکر ۱۹۵۶ء تک عام مدارس کے چند ایک عظیم الشان ادارے قائم ہوئے۔ مفتی محمد حسنؒ نے لاہور میں جامعہ اشرفیہ کے نام سے مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا یوسف بنوریؒ نے کراچی میں اور مولانا احتشام الحق تھانوی نے ٹنڈوالہ یار سندھ میں اعلیٰ مدارس قائم کئے اکوڑہ خشک کا مدرسہ بھی اسی صف میں شامل ہے۔ بریلوی مکتب فکر مفتی محمد حسین نعیمیؒ نے جامعہ نعیمیہ لاہور میں اور جمعیت اہلحدیث نے فیصل آباد میں جامعہ سلفیہ قائم کیا اس سخت مسلکی فضا میں بعض ایسے مدارس بھی قائم ہوئے جو مسلکی مسائل میں اعتدال پر قائم اور سید مودودیؒ کی فکر سے متاثر تھے۔ ان میں جامعہ عربیہ گوجرانوالہ جسے مولانا محمد چراغؒ نے قائم کیا اور پشاور اور مردان کے مدارس ہیں جنہیں مولانا چترالی اور مولانا گوہر رحمٰن نے قائم کیا۔ ان کے علاوہ ملتان کے خیر المدارس، جامع العلوم، قاسم العلوم اور انوار العلوم بھی نمایاں ترین مدارس ہیں۔

ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے بے شمار چھوٹے بڑے مدارس ہیں جو تعلیم میں مصروف ہیں ان مدارس نے اب اپنے نصابوں کو نئے انداز میں مرتب کیا ہے اور ہر مسلک نے ایک ایک تنظیم کے تحت امتحانوں کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ نصاب کی درجہ بندی کی ہے اور نئے اسلوب کے ساتھ تدریس کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ابھی تک کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی۔ مسلکی وابستگی میں اور پختگی پیدا ہوئی اور محدود مذہبی سوچ اور مستحکم ہوئی ہے البتہ انہیں جدید تنظیم کا شعور پیدا ہوا ہے اور مدرسہ و مسجد سے باہر نکل کر معاشرے پر اثر انداز ہونے کا جذبہ پیدا ہوا ہے۔ ان کی تاثیر کے جائزے کے لئے دو پہلوؤں کو دیکھنا ضروری ہے۔

مذہبی تاثیر

دینی مدارس کی سب سے بڑی تاثیر مذہبی ہے۔ ان مدارس سے ہزاروں کی تعداد میں جو طلبہ فارغ ہوتے ہیں وہ مساجد کے آئمہ و خطباء مقرر ہوتے ہیں۔ پاکستان کے انتہائی سیکولر ماحول میں بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنیادی مذہبی فرائض یہی لوگ انجام دیتے ہیں۔ نکاح، بچوں کی ولادت کے مواقع، وفات و جنائز کی رسوم اور دیگر مذہبی و روحانی مسائل کے لئے انہی حضرات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور انہی کی بات حرف آخر تصور ہوتی ہے۔ عوام تو ہر وقت ان کی طرف متوجہ ہوتے ہی ہیں لیکن انتہائی سیکولر اور مغرب زدہ افراد بھی ان مواقع پر ان کے محتاج ہوتے ہیں۔ مساجد میں جانے والے لوگوں کو پانچ وقت جس شخص سے سابقہ پڑتا ہے وہ دینی مدرسہ کا طالب علم ہوتا ہے اور جمعہ کے روز جس شخص کا خطبہ سننا پڑتا ہے وہ بھی دینی مدرسہ کا فارغ التحصیل ہوتا ہے۔ یہ خطابات غیر معمولی تاثیر رکھتے ہیں اور آہستہ آہستہ ذہن سازی کرتے ہیں۔ ان مساجد اور مذہبی رسوم کی بدولت دینی مدارس کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یونیورسٹیوں میں اسلامیات و عربی شعبوں کے فضلاء اس قابل نہیں سمجھے جاتے کہ انہیں دینی رہنمائی کا منصب دیا جاسکے۔ دینی مدارس کے ساتھ ایک خاص وضع قطع بھی اور ایک خاص لباس بھی منسوب ہوگیا ہے۔ عام معاشرے سے مختلف اور الگ تھلگ یہ گروہ معاشرے پر بے پناہ تاثیر رکھتا ہے اور اس تاثیر کو جب استعمال کرنا چاہے تو اسے استعمال کرسکتا ہے۔ اس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس طبقہ کے بعض افراد تو بلاشبہ ایک رول ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں اور اپنی نیک نفسی اور بے لوثی کے باعث ہمیشہ قابل احترام رہے ہیں۔ کسی بڑے سے بڑے دین بیزار شخص کو ان کی بے احترامی کی جرات نہیں ہوئی۔ یہ طبقہ جب چاہے تو لوگوں کو بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار کرسکتا ہے۔ مغرب زدہ طبقہ کی طرف سے مخالفت کی وجہ سے ان کی توقیر میں اضافہ ہوا ہے اور عوام الناس نے کمزوریوں کے باوجود انہی کو اپنا پیشوا و مقتدا مانا ہے اور دینی معاملات میں انہی سے رہنمائی حاصل کی ہے فرقہ وارانہ مسائل میں ان کی محدود اور منفی سوچ ایک واضح معاملہ ہے لیکن ان معاملات میں بھی عوام بالآخر انہی کی رائے کو قبول کرتے ہیں اور اسی بنیاد پر مسلکی وابستگی متعین کرتے ہیں۔

سیاسی تاثیر

قیام پاکستان کے بعد سیاسی شعور رکھنے والے علماء نے نرم رویہ اختیار کیا کیونکہ سیاسی جدوجہد کے نتائج ان کی توقع سے مختلف تھے۔ انہوں نے اپنی جمعیتیں بنائیں جو مسلکی بنیادوں پر منظم تھیں۔ چونکہ انہیں مسلک بہت عزیز تھے اس لئے ان کے تحفظ کے لئے سیاسی وابستگیاں بھی اختیار کیں۔ مثلاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بریلوی اور شیعہ مکاتب فکر نے ہمیشہ حکمرانوں کے ساتھ سازگاری پیدا کی۔ انہیں اپنے جلسوں میں بلایا اور اپنے مدارس میں ان کا استقبال کیا اور یوں حکومت کی مشینری میں نفوذ حاصل کیا۔ اس نفوذ کی وجہ سے روزمرہ کے کئی معاملات آسان ہوئے۔ مقامی انتظامیہ کے ساتھ بھی معاملات ٹھیک رہے۔ دینی مدارس چونکہ مسلکی بنیادوں پر منظم ہوئے تھے اس لئے کسی نہ کسی طرح مسلک کے سیاسی رجحانات سے متاثر ہوئے۔ اگرچہ دینی مدارس کی انتظامیہ نے عملی سیاست سے ہمیشہ اجتناب کیا ہے اور حکومت وقت کے ساتھ تصادم کی پالیسی سے گریز کیا ہے لیکن بعض اوقات انہیں کسی تحریک کا ساتھ دینا پڑا ہے۔ مثلاً تحفظ ختم نبوت کی تحریک بنیادی طور پر دیوبندی علماء نے اور بالخصوص مجلس احرار نے منظم کی تھی لیکن اس نے عملاً تمام مکاتب فکر کو جذب کر لیا تھا۔ اسی طرح بھٹو صاحب کے خلاف جو تحریک چلی تھی اس نے بھی تمام مکاتب فکر کو بالآخر شامل کر لیا۔

اصل میں دینی حلقوں کو ایک پریشر گروپ کے طور پر وجود میں لانے کا بڑا محرک تو سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی وہ مہم تھی جسے جماعت اسلامی نے اسلامی دستور اور اسلامی نظام کے عنوان سے چلایا تھا۔ یہ اس مہم کا نتیجہ تھا کہ پاکستانی معاشرہ آہستہ آہستہ دو واضح کیمپوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک وہ جو سیکولر ریاست اور سیکولر معاشرے کا حامی تھا اور دوسرا وہ جو اسلامی حکومت کے تصور کا حامی تھا۔ پہلے گروہ میں سوشلسٹ، کمیونسٹ اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کے حامی سیکولر عناصر تھے اور دوسرے میں ہر قسم کے مذہبی رجحانات رکھنے والے لوگ شامل تھے۔ سیکولر حضرات برسرِ اقتدار تھے اور مذہبی گروہ حزب اختلاف کا پریشر گروپ تھا۔ برسر اقتدار طبقہ اگرچہ مذہبی طبقات میں تفریق پیدا کرنے اور بعض کو ساتھ ملانے میں کامیاب ہو جاتا لیکن بحیثیت مجموعی دینی طبقہ کی سیاسی تاثیر باقی رہتی بالخصوص خطباء کا اسلامی تاریخ کے سنہری ادوار اور طاقتور مسلمان شخصیات کی رومانوی پیش کش عوام کے اسلامی شعور کی آبیاری کرتی رہتی۔ حزب اختلاف ہر تحریک اور حکومت کے خلاف اٹھنے والی ہر مہم اس رومانوی تصور کو اور مستحکم کر دیتی۔ تحفظ ختم نبوت سے لیکر بھٹو صاحب کے خلاف اٹھنے والی عوامی تحریک میں مساجد اور مدارس نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ دینی مدارس کے طلبہ نے پاکستانی معاشرے کی اسلامی سوچ میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ دینی مدارس نے جماعت اسلامی کی سرگرمیوں کا ساتھ تو نہیں دیا لیکن جماعت کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چلائی ہوئی ہر مہم کو دینی مدارس نے اپنایا ہے۔ اگر پاکستانی معاشرے کو فکری اعتبار سے سیکولر بننے سے روکنے میں جماعت اسلامی کا بنیادی کردار ہے تو اس کی اسلامی شناخت کے عوامی مظاہر میں بنیادی کردار دینی مدارس کا ہے کہ اس کے فضلاء نے عوامی سطح پر کام کیا ہے۔

دینی مدارس ہمارا تاریخی تسلسل ہیں

دینی جماعتوں اور دینی کارکنوں کا جو تعمیری کردار ہے اور معاشرے کے اسلامی تشخص کیلئے ان کی جو خدمات ہیں ان سے قطع نظر ان مدارس کی ایک اور اہمیت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دینی مدارس ہمارے تاریخی تسلسل کی علامت ہیں۔ بغداد، نیشاپور، بخارا، دمشق، ازھر قیروان سے اشرفیہ، جامعہ عربیہ، نعیمیہ، خیر المدارس اور بنوری ٹاؤن تک ایک تسلسل ہے۔ زبان وادب کا، علوم وبیان کا اور اظہار وتصنیف کا۔ نصابی کتابیں، شرح وحواشی اور اسباق واملاء سب کچھ تو وہی ہے۔ دینی مدارس ہماری روایت اور ہمارے تاریخی تسلسل ہیں۔ جگہیں بدلی ہیں، تعمیرات مختلف ہیں، تشریح وتعبیر کی زبان مختلف ہے لیکن اصطلاحات وہی ہیں، نصوص وہی ہیں، مصنفین وشارحین وہی ہیں، علوم وفنون وہی ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ غزالی وامام الحرمین کی روحیں آجائیںگی۔ دینی مدارس کی تاثیر کا سب سے بڑا پہلو مسلمانوں کے تاریخی تسلسل کا تحفظ ہے۔ مغربی اقوام نے ہمارا تاریخی تسلسل توڑ دیا ہے۔ انہوں نے ہمارے ادارے تباہ کئے، ہمیں بے اختیار کیا اور ہمیں ہمارے ماضی سے بیزار کیا۔ ہمارے معاشروں میں اپنا نظام تعلیم رائج کیا، اپنے سیاسی ادارے منظم کئے، اپنا عدالتی نظام قائم کیا اپنی عسکری تنظیم مستحکم کی۔ یوں ہماری قومی تاریخ کو اپنی تاریخ سے جوڑنے کی کوشش کی لیکن اس کی راہ میں آخری رکاوٹ دینی مدارس ہیں کہ وہ پاکستانی معاشرے کو اپنی تاریخ سے وابستہ کئے ہوئے ہیں۔

پاکستان کے دینی مدارس کے خلاف جو مہم چل رہی ہے اس کا سبب مخالفین کا یہی ادراک ہے۔ بد قسمتی یہ ہے کہ مغرب کو اپنے تخریبی مقاصد کی تکمیل کے لئے ہمارے ہی معاشرے سے تخریب کار عناصر مہیا ہو گئے ہیں جو ان کی زبان میں انہی کے دیئے ہوئے ایجنڈے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ مغربی مقاصد کی تکمیل کے لئے کام کرنے والے یہ عناصر دینی مدارس کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ دینی مدارس کے منتظمین کو شاید اس کا احساس ہو گا۔ اگر ہے تو انہیں اپنے معاملات کی اصلاح کرنی چاہیئے تاکہ مخالفین کو اپنے مقاصد حاصل کرنے کا موقعہ نہ ملے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

توکل علی اللہ

سلطان محمود غزنویؒ کے دربار میں بیسیوں ایسے مشہور منجم جمع تھے کہ زمانے میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے، مگر سلطان کسی معاملہ میں ان کی رائے نہ لیتے تھے، ایک مرتبہ کسی دوست نے دریافت کیا کہ علم نجوم کے اتنے بڑے استاد حضور کے پاس جمع ہیں، مگر آپ کبھی ان سے کوئی بات نہیں پوچھتے، ان کی موجودگی کا فائدہ کیا ہے؟ سلطان نے جواب دیا کہ ان لوگوں کو صرف اس لیے رکھا گیا ہے کہ ملک میں ہر علم اور ہر فن کے ماہروں کی موجودگی ضروری ہے، کہ وقت بے وقت کام اٹکا نہ رہے، ورنہ میرے معاملات کی بنیاد صرف دو باتوں پر ہے، اول اللہ پر توکل، دوم شریعت کا فتویٰ اور مخلصوں کی رائے۔

(جوامع الحکایات و لوامع الروایات)

© rasailojaraid.com